© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

علم الکلام، اجتہاد اور فکرِ اقبال

علامہ اقبال مسلمانوں میں ایک نئے علمِ کلام کا فروغ چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ فقہ اسلامی کی تدوین نو کے بھی متمنی تھے۔ یہ مضمون اس باب میں اقبال کے خیالات کا جائزہ پیش کرتا ہے۔

اقبال عصر جدید کے پیام بر بھی ہیں اور نقاد بھی۔ وہ جہان نو کے پیدا ہونے کی نوید بھی سناتے ہیں اور دنیا کے دگرگوں ہونے پر شاکی بھی ہیں۔ انہیں انقلابات عالم کے جلو میں طلوع اسلام کا یقین ہے۔ لیکن تشویش بھی ہے کہ کہیں اولاد ابراہیم کا پھر سے امتحان تو مقصود نہیں کہ دنیائے جدید ساتھ نمرود اور آگ بھی لائی ہے۔ ترکی میں خلافت کی جگہ جمہوریت کی آمد کو ترکوں کا اجتہاد بتا کر اس کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں اور جمہوری قبا میں دیو استبداد کی پا کوبی کی شکایت بھی کرتے ہیں۔ دنیائے جدید کے تناظر میں علامہ اقبال کیا کسی تذبذب کا شکار ہیں؟ آج کی نشست میں ہم اس سوال کا جواب برصغیر پاک و ہند میں تحریک تجدید میں تلاش کریں گے، بالخصوص اس تحریک کے اس سفر کے حوالے سے جو سید احمد خان کے اس احساس سے شروع ہوا کہ جدید دنیا کے تناظر میں مسلمانوں کو جدید علم الکلام کی ضرورت ہے اور جو علامہ اقبال کی دعوت اجتہاد پر ختم ہوا۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی کمزوری یہ تھی کہ علم الفقہ تیزی سے بدلتی زندگی کا ساتھ نہیں دے رہا۔ اقبال نے ایک نئی جورس پروڈنس مرتب کرنے کی دعوت دی۔ علم الکلام سے اجتہاد تک کا یہ سفر فکر اسلامی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

تحریک تجدید کی سب سے بڑی کمزوری یہ شمار کی جاتی ہے کہ وہ دنیائے جدید کے بارے میں دوٹوک بات نہیں کہتی۔ تنقید بھی کرتی ہے اور حمایت بھی جاری رکھتی ہے۔ اقبال شناسوں کا ایک طبقہ اسے تذبذب، تردد حتیٰ کہ تضاد کا نام دیتا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال بنیادی طور پر شاعر ہیں، مفکر نہیں۔ اس لئے ان کی فکر میں ربط اور نظم کی تلاش بے سود ہے۔ معروف کینیڈین مصنف کینٹ ویل سمتھ کے نزدیک تو یہ تضاد اتنا شدید ہے کہ اقبال کی شخصیت دہرے پن کا شکار نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'ہندوستان میں جدید اسلام' میں اقبال کو باقاعدہ دو ابواب میں تقسیم کیا۔ ایک کا عنوان ہے۔ رجعت پسند اقبال، دوسرے کا ترقی پسند اقبال۔

فکر اقبال میں عصر جدید کا والہانہ استقبال بھی ہے اور تیز دھار تنقید بھی۔ فکر اقبال کے یہ دونوں پہلو بے حد اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ یہ اس طرح مربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں بلکہ دونوں پہلو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ جب اقبال یہ شکایت کرتے ہیں کہ عصر حاضر میں پختہ افکار کہاں۔ اس عہد کی ہوا تو ہر چیز کو خام رکھتی ہے تو وہ دور جدید کی دینامیت اور مسلسل تغیر کی بات کر رہے ہیں جس میں میکانیکی فکر کی آسودگی نہیں۔ مارشل برمن نے اپنی کتاب میں جدیدیت کے بارے میں اپنے تجربات اور احساسات کو قریب قریب انہی الفاظ میں بیان کیا تھا۔ ان کی کتاب کا عنوان ہے: ہر ٹھوس شے ہوا میں پگھلتی جا رہی ہے۔ اس احساس میں دنیائے جدید کی مخالفت سے زیادہ اس تشویش کا اظہار ہے کہ دنیا انسان کی گرفت سے نکلتی جا رہی ہے۔ اس دور کی خوبی یا خرابی مسلسل تغیر کا احساس ہے۔ کوئی شے کسی جگہ ٹھہرتی نظر نہیں آتی۔ ناخوب بتدریج خوب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ عقل محوِ حیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ انقلاب

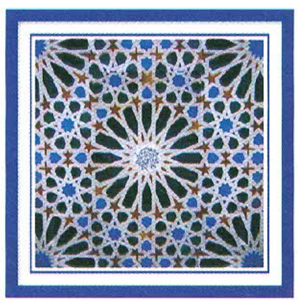

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیہم عقل وخرد کو خیرہ کئے دے رہا ہے۔

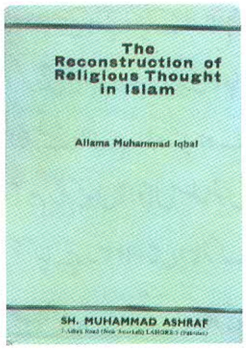

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

دور جدید کے انقلابات پر تشویش کو نہ تو مخالفت کا نام دیا جا سکتا ہے اور نہ اس تنقید کو تضاد کا۔ یہ تو اس کڑھن کا اظہار ہے کہ نتائج ہماری گرفت میں کیوں نہیں ہیں۔۔

تحریک تجدید

علامہ اقبال عصر جدید کے پہلے پیامبر نہیں ہیں اور نہ ہی اسلام میں تجدید و احیا کی دعوت کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر صدی میں ایک مجدد ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ اس بات کی شہادت ہے کہ تاریخ اسلام میں تجدید کا عمل ایک مسلسل عمل ہے۔ سید احمد خان کے نزدیک مسلمانوں کی کمزوری کا بڑا سبب ان کا سیاسی زوال نہیں بلکہ علمی زوال ہے۔ سید احمد خان نے مسلمانوں میں تعلیم کی تجدید کی طرف توجہ دی اور علم الکلام کی تجدید پر زور دیا۔

جدید علم الکلام

اس جدید علم الکلام کی اساس فطرت اور قوانین فطرت کے فلسفے پر تھی۔ سید احمد خان کے نزدیک قرآن اور فطرت دونوں اللہ کی قدرت کے شاہکار ہیں، قرآن اللہ کا کلام ہے تو فطرت اللہ کا کارنامہ۔ وہ اسلام اور اس کے قوانین کو قوانین فطرت کی طرح اٹل سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو اصول، عقائد اور قانون قانون فطرت کے مطابق نہیں تھے وہ ان کی تاویل کرتے اور اگر تاویل نہ ملے تو وہ انہیں غیر اسلامی قرار دے کر رد کرنے میں دریغ نہ کرتے۔

انیسویں صدی میں مغربی سائنسی فکر پر بھی میکانکیت کا غلبہ تھا۔ یہاں سائنس مذہب کی جگہ لینا چاہتی تھی اس لئے مذہب کے ابدی اصولوں کی طرح سائنس بھی اٹل اور نا قابل تبدیل قوانین کی تلاش میں تھی۔ سید احمد خان بھی اسی سوچ کے حامل تھے۔

> انیسویں صدی میں مغربی سائنسی فکر پر بھی میکانکیت کا غلبہ تھا۔یہاں سائنس مذہب کی جگہ لینا چاہتی تھی اس لئے مذہب کے ابدی اصولوں کی طرح سائنس بھی اٹل اور نا قابل تبدیل قوانین کی تلاش میں تھی -

علامہ اقبال اس کے برعکس اس بات کے قائل تھے کہ قرآن نے انسانی فکر اور انسانی قانون سازی کے عمل کے لئے نہ صرف معتدبہ گنجائش چھوڑی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان اصولوں میں اتنی زیادہ وسعت رکھی ہے کہ حقیقت میں یہ اصول انسانی فکر کے لئے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔

سید احمد خان نے جدید علم الکلام کی جو دعوت دی تھی اسے صحیح پذیرائی نہیں مل سکی۔ سید احمد خان کے قریبی ساتھیوں میں علامہ شبلی نعمانی کا کہنا تھا کہ قدیم علم الکلام میں کوئی خرابی نہیں اس لئے جدید علم الکلام کی کوئی ضرورت نہیں۔

دنیائے جدید کے تناظر میں علامہ اقبال کے علم کلام میں مسجد قرطبہ، خضر راہ، طلوع اسلام اور ان کے خطبات بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اندلس میں مسجد قرطبہ اقبال کو انقلابات زمانہ کی یاد دلاتی ہے۔ اقبال کے لئے عصر جدید تمام تر انقلابات زمانہ سے عبارت ہے۔ اقبال یورپ کے انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے اس جدید دنیا کے تناظر میں عالم اسلام کو بھی شامل رکھتے ہیں۔ جرمنی میں اصلاح دین کی شورش نے نقش کہن کے سارے نشان مٹا دئے ہیں۔ فرانس میں ایسا انقلاب آیا ہے کہ مغربیوں کا جہان دگرگوں ہو گیا ہے۔ اٹلی کی ملت رومی نژاد جسے قدامت پرستی نے بوڑھا کر دیا تھا وہ بھی لذت تجدید سے پھر جوان ہو گئی ہے۔ ساری دنیا بدل رہی ہے۔ مسلمان اس تب و تاب جاودانہ سے دور کیسے رہ سکتے ہیں۔ اقبال کو روح مسلمان میں بھی وہی اضطراب دکھائی دے رہا ہے ۔ دیکھئے اس بحر کی تہ سے کیا اچھلتا ہے۔ گنبد نیلوفری یہاں کیا رنگ بدلتا ہے۔ آب روان کبیر کے کنارے اقبال بھی کسی اور زمانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۲۲ میں جب دنیائے اسلام خونیں انقلاب سے گذر رہی تھی۔سلطنت عثمانیہ روبہ زوال تھی اقبال نے خضر راہ کا پیغام سنایا کہ گردش پیہم سے ہی زندگی کا جام پختہ تر ہوتا ہے۔یہی راز دوام زندگی ہے۔اس تاریک رات میں بطن گیتی سے آفتاب تازہ ابھرنے والا ہے۔ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کیوں۔فطرت انساں نے تمام زنجیریں توڑ ڈالیں تو اب جنت سے دوری پر چشم آدم پرنم کیوں؟اقبال مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اسلام نے حریت عام کا جو خواب دیکھا تھا اب اس کی تعبیر دیکھنے کا وقت آگیا ہے۔۱۹۲۳ میں اتاترک نے اتحادیوں کو شکست دیتے ہیں اور سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں تو اقبال اسے طلوع اسلام قرار دیتے ہیں۔ وہ دور گراں خوابی کے گذرنے پر خوش ہیں۔ستاروں کی تنک تابی میں صبح روشن کی دلیل دیکھتے ہیں۔افق سے آفتاب تازہ کے ابھرنے کی امید جگاتے ہیں۔

عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹنے پر ناامیدی سے منع کرتے ہیں کہ صد ہزار انجم کے خون سے ہی سحر پیدا ہوتی ہے۔وہ پرامید ہیں کہ کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہونے والی ہے۔ ۱۹۲۴ میں اتاترک نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تو مسلمانوں پر ہر طرف افسردگی کے بادل چھا گئے۔برصغیر سر تا پا احتجاج بن گیا۔ تاہم علامہ نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے دور جدید کا اجتہاد قرار دیا کہ اب خلافت ایک فرد کی بجائے امت میں ودیعت ہوگئی، ملوکیت کی چھاپ دور ہو گئی تھی۔پیر حرم کی کم نگاہی سے حرم رسوا ہو رہا تھا لیکن تاتاری جوانوں کی صاحب نظری کام آئی۔

مسجد قرطبہ

لیکن جس انقلاب کا خواب انہوں دیکھا تھا اس کی تعبیر تلخ نکلی۔مغرب کا جمہوری نظام بھی جمہور کو مکمل آزادی نہ دے سکا۔آزادی کی نیلم پری اب بھی خوابوں کے کوہ قاف سے نہیں اتری تھی۔ مغرب کا جمہوری نظام وہی پرانا ساز تھا جس کے پردوں سے صرف نوائے قیصری ہی سنی جاسکتی تھی۔مغرب کے خردمندوں کو جس حکمت پہ ناز تھا وہ ہوس کے خونیں پنجے میں تیغ کارزاری بن گئی تھی۔دور جدید کی فریب کاری پر اقبال کی تنقید میں تیزی آتی گئی۔لیکن اسے گلہ نومیدی تو کہا جاسکتا ہے اظہار بریت نہیں۔اقبال دنیا کو جدید تناظر میں دیکھتے ہیں اور اسی کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ تنقید اسی تناظر کا حصہ ہے۔اس کائنات میں عقائد علم الکلام سے نہیں اجتہاد اور اعمال سے ترتیب پاتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک قدیم علم الکلام یونانی افکار میں الجھ کر زندگی میں بے اثر ہو کر رہ گیا تھا۔علم الکلام کا اثر دوسرے علوم پر بھی پڑا۔روایت پسند تمدن، تصوف، شریعت، کلام تمام بتان عجم کے پجاری بن گئے۔ شروع میں علم فقہ علم الکلام کا حصہ تھا اس لئے اس کے بنیادی اصول بھی کلام سے متاثر ہوئے۔لیکن قانون کو چونکہ زندگی اور اس کے حقائق کا سامنا ہوتا ہے اس لئے فقہ کا قانونی ارتقا علم الکلام کی میکانکیت پر قانع نہیں رہ سکتا۔بقول اقبال ''زندگی کا پیچیدہ رویہ ایسے متعین اور ناقابل تغیر قوانین کا پابند نہیں ہوسکتا جو منطقی طور پر چند عمومی تصورات سے ماخوذ ہوں۔تاہم ارسطو کی منطق کی عینک سے دیکھا جائے تو زندگی سرا سر میکانیکی نظر آتی ہے جس میں اندرونی طور پر کوئی اصول حرکت موجود نہیں''

مسلمانوں میں یونانی تصوریت اور کلاسیکیت کے زیر اثر میکانیکیت دینی فکر کا حصہ بن گئی۔ سکون پسندی اور میکانکیت کی یہ سوچ قرآنی تعلیمات سے مناسبت نہیں رکھتی۔ایک تہذیبی تحریک کی حیثیت سے اسلام نے قدیم سکونی تصور کو رد کیا اور اس کی جگہ ایک دینامی تصور پیش کیا۔

تاریخ فقہ اسلامی کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ فقہا نے اسلامی قانون کے چار ماخذ بتائے ہیں: قرآن، سنت، قیاس اور اجماع۔قرآن اور سنت اسلامی قانون کے بنیادی ماخذ ہیں۔قیاس وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے قرآن وسنت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احکام سے نئے قوانین مرتب کئے جاسکتے ہیں اور اجماع کے ذریعے ان قوانین پر اتفاق رائے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ قیاس اگر میکانیکی طریقے پر مبنی ہو تو وہ جمود پیدا کرتا ہے اور بقول اقبال زندگی آگے بڑھ جاتی ہے اور قانون پیچھے کھڑا رہ جاتا ہے۔ قیاس کے قائل فقہا کو یہ یقین تھا کہ زندگی کے تمام مسائل میکانیکی انداز میں حل کئے جاسکتے ہیں۔ اس کی رو سے ہر نئے پیش آمدہ مسئلہ کے لئے لازمی طور سے ماضی میں کوئی نظیر پہلے سے موجود ہوتی ہے جس کے مطابق نئے مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے فقہا نے قیاس کو اجتہاد کے اصول سے مربوط کیا جو حرکت کا اصول تھا اور اس طرح شریعت اسلامی زندگی کا منبع بن گئی۔ اقبال نے اسی طرز فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے اجتہاد کے اصول کو اجماع سے وابستہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ اجتہاد ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کر سکے۔ اجتہاد محض انفرادی فتاوی تک محدود نہ رہے بلکہ باقاعدہ قانون سازی کا ادارہ بن جائے۔

علامہ کے نزدیک تقلید کے رواج نے بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا تھا۔ ورنہ نہ تو فقہی مذاہب کے کسی امام نے کبھی یہ دعوی کیا تھا کہ اس کا استدلال اور اس کی رائے حرف آخر ہے اور نہ ہی فقہا نے کبھی اجتہاد کے نظری امکان کو رد کیا۔

قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ زندگی ترقی پسندانہ تخلیق کا عمل ہے اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر نسل کو اپنے مسائل کو خود حل کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس ضمن میں وہ سلف کے کارہائے نمایاں سے رہنمائی ضرور حاصل کرے لیکن ان کی پابند نہ ہو۔

اقبال کے بقول موجودہ حالات میں جس طرح تائید اصول مذہب کے لئے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لئے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جو مسلمات کی بنا پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظّم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام صورتوں پر حاوی ہو"۔

۱۹۲۴اور ۱۹۲۵ میں جب عالم اسلام بہت بڑے سیاسی اور فکری انقلابات سے دوچار تھا تو علامہ نے صوفی تبسم کے نام خط میں لکھا کہ میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا"۔ اسی زمانہ میں علامہ نے اجتہاد کے موضوع پر لاہور میں ایک تفصیلی خطبہ دیا۔

علامہ اقبال کا کہنا تھا کہ ماضی سے بے جا عقیدت اور اس کے مصنوعی احیا سے مسلمانوں کے انحطاط کا علاج نہیں ہوسکتا۔ اس ہر لحہ بدلتی دنیا میں اگر کوئی اصول پاؤں جمانے کی جگہ دے سکتا ہے تو وہ اجتہاد کا اصول ہے۔ علامہ اقبال نے علم الکلام کی بجائے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا۔ آج امت مسلمہ کی غالب اکثریت اجتہاد کی ضرورت کی قائل ہو چکی ہے۔ بہت سے اجتہاد کے ادارے وجود میں آچکے ہیں۔ بہت سے مسائل میں نئی تعبیریں سامنے آئی ہیں۔ دنیائے جدید کے تناظر میں فقہ اسلامی کو کئی نئی جہتیں ملی ہیں۔ اپنے دور میں علامہ کی دعوت اجتہاد کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ روایت پسندوں کو خطرہ تھا کہ اجتہاد انہیں اپنی روایت سے دور اسی مغرب کی گود میں ڈال دے گا جس کی چیرہ دستیوں کا وہ شکار تھے۔ وقتی مصلحتوں کے سبب انہوں نے تقلید کی گود میں عافیت تلاش کی۔ کیونکہ

مضمحل گردد چو تقویم حیات　　ملت از تقلید می گیرد ثبات

آج پھر عالمی استبداد کی وجہ سے روح مسلمان اضطراب میں ہے کیونکہ خردمندان مغرب کی حکمت آج پھر ہوس کے پنجہ خونیں میں ستم ران ہے۔ دیو استبداد آج پھر جمہوری قبا میں پاکوب ہے۔ فرنگ پھر رہگذر سیل بے پناہ سے سلامت نکل آئے ہیں۔ کسی آب روان کبیر کے کنارے آج پھر کوئی ان اندیشوں میں گم ہے کہ کہیں مسلمان پھر عالمی استبداد کے خوف سے تقلید میں عافیت تو تلاش نہیں کریں گے؟

مسلمانوں میں یونانی تصوریت اور کلاسیکیت کے زیر اثر میکانیکیت دینی فکر کا حصہ بن گئی۔ سکون پسندی اور میکانکیت کی یہ سوچ قرآنی تعلیمات سے مناسبت نہیں رکھتی۔

اکادمی ادبیات اسلام آباد میں
یوم اقبال (۲۰۰۴) پر پیش کردہ مقالہ سے ماخوذ

© rasailojaraid.com